خالد ندیم

موضوعاتِ شبلی کا جواز، بہ اندازِ دگر

تاریخِ زبان و ادبِ اردو میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء- ۱۹۱۴ء) کی حیثیت ایک ایسے درخشندہ ستارے کی ہے، جس کی کرنیں مسافرانِ علم و ادب کے لیے آج بھی مشعلِ راہ ہیں۔ علامہ شبلی اعظم گڑھ میں مولانا علی عباس چریا کوٹی، جونپور میں مولوی ہدایت اللہ خاں، غازی پور میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی اور مولوی فیض اللہ مئوی، رام پور میں مولانا ارشاد حسین رام پوری اور لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارن پوری جیسے نامور علما سے مستفیض ہوئے، جب کہ تقریباً ایک مہینا دارالعلوم دیوبند میں قیام کیا۔ ۱۸۷۶ء میں حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی، باپ کی خواہش پر ۱۸۸۰ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا، ۱۸۸۱ء میں کچھ عرصہ وکالت کی، ۱۸۸۲ء میں بے روزگاری سے تنگ آ کر نیل کے کارخانوں کی دیکھ بھال کی، ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۶ء تک علی گڑھ میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے سرسید احمد خاں کی سرپرستی اور رفاقت میسر آئی، ۱۸۹۲ء میں استنبول، لبنان، شام اور مصر کی سیاحت کی، ۱۸۹۴ء سے ندوۃ العلما کی سرگرمیوں میں حصہ لیا، ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد دکن میں ملازمت کی، ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک دارالعلوم ندوہ کے معتمد رہے اور بالآخر اگست ۱۹۱۴ء میں بھائی مولوی محمد اسحاق کی اچانک وفات کے فوراً بعد اعظم گڑھ واپس آئے، دارالمصنّفین کی بنیاد رکھی اور یہیں پر پیوندِ خاک ہوئے۔ ایک طرف اردو، عربی اور فارسی پر دسترس رکھتے تھے اور دوسری جانب مذہب، فقہ، علمِ کلام، شاعری، سفرنامہ، سوانح نگاری، مضمون نگاری، تنقید، تحقیق، سیرت؛ غرض ہر شعبۂ علم کے مردِ میدان تھے۔ یوں دیکھا جائے تو شبلی کی زندگی متنوع قسم کی مصروفیات اور مختلف النوع سرگرمیوں میں گزری، ایسے میں اگر ان کے تصنیفی موضوعات کا جائزہ لیا جائے تو دل چسپ صورتِ حال سامنے آتی ہے۔

مختلف مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے اور مختلف علما سے مستفیض ہونے کے بعد 'مولانا شبلی نے

غیر مقلدین کے رَد کے لیے کمرِ ہمت چست باندھی۔ جب یہ سن پاتے کہ فلاں گاؤں میں کوئی غیر مقلد ہُوا ہے یا آیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچ جاتے اور مناظرے کا چیلنج دیتے۔ مناظرانہ تقریروں کے علاوہ اس راہ میں تحریری خدمت بھی انجام دی،[1] چنانچہ ۱۸۷۷ء میں مولانا عبدالحئ فرنگی محلّی کے ایک رسالے امام الکلام فی ما یتعلق بالقرأۃ خلف الامام کے جواب میں شبلی نے عربی زبان میں چوبیس صفحات کا ایک مختصر رسالہ اسکات المعتدی علی انصات المقتدی تحریر کیا، جو دسمبر ۱۸۸۰ء میں مطبع نظامی کانپور سے چھپا۔ شبلی کی اس تحریر کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے جواب میں مولانا عبدالحئ اور ان کے شاگردوں کی طرف سے چار رسالے چھاپے گئے۔ شبلی کے اس رسالے کی بازگشت ۱۸۹۲ء میں ان کے قیامِ استنبول کے دَوران اُس وقت بھی سنائی دی، جب ان کے میزبان شیخ عبدالفتاح کے ہاں ایک معروف صوفی شیخ علی ظبیان نے اس رسالے کو دیکھا اور کہا 'آہا! یہ رسالہ، مدت ہُوئی، مَیں نے دمشق میں اپنے شیخ کے پاس دیکھا تھا تو انھوں نے اس کے مصنف کی نسبت کہا تھا، شکر اللہ مساعیہٗ۔ شبلی اس بات پر نہایت مسرور ہوئے کہ میری ناچیز تصنیف یہاں تک پہنچی اور لوگوں نے اس کو نگاہِ قبول سے دیکھا۔[2] اسکات کے بعد ۱۸۸۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے چالیس صفحات پر مشتمل ان کی لکھی ہوئی ظل الغمام فی مسئلہ القرأۃ خلف الامام منظرِ عام پر آئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی گڑھ جانے تک شبلی کی تصنیف و تالیف کا دائرہ مذہبی، بلکہ فقہی مسائل و مباحث تک محدود رہا۔

۱۸۸۳ء میں شبلی علی گڑھ پہنچے تو ان کی زندگی نے دوسرا رُخ اختیار کیا۔ وہ قدیم طرزِ تعلیم سے مستفیض ہوئے تھے، لیکن اب جدید طرزِ تعلیم کو دیکھ رہے تھے۔ ایسے تعلیمی ماحول میں ان میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ علی گڑھ تحریک کے فکری اثرات قبول کیے بغیر نہ رہ سکے، چناں چہ انھوں نے اسی احساس کے تحت ۱۸۸۵ء میں علی گڑھ تحریک کی حمایت میں ایک مثنوی صبحِ امید لکھی، جو ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد شبلی نے ایک مقالہ 'مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم' لکھا، جو ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۷ء کو قیصر باغ لکھنؤ کی شاہی بارہ دری میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے دوسرے اجلاس میں پڑھا گیا اور ۱۸۸۸ء میں قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ مضمون ایک طرف تعلیم سے متعلق تھا تو دوسری جانب مسلم تاریخ سے بھی منسلک، یوں شبلی کے تاریخی ذوق کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ شبلی کے تاریخی ذوق کا آغاز اُن کے قیامِ لاہور کے دَوران ہی میں ہو گیا تھا، جب انھوں نے ڈاکٹر لائٹنر کی کتاب سنینِ اسلام (مطبوعہ ۱۸۷۶ء) کا مطالعہ

کیا تھا۔ مولانا اس کتاب میں مسلمان بادشاہوں کے حالات اور مسلمانوں کے علمی کمالات پڑھ پڑھ کر بہت خوش ہوتے تھے،[۳] البتہ ان کے اس ذوق کی اصل آبیاری علی گڑھ میں آ کر ہوئی، جب انھیں سرسید کے کتب خانے سے استفادے کا موقع ملا۔ سرسید نے اپنے کتب خانے کی نسبت انھیں عام اجازت دی ہوئی تھی اور ان کا یہ حال تھا کہ الماریوں کے سامنے گھنٹوں کھڑے رہتے اور کبھی تھک جاتے تو زمین ہی پر اکڑوں بیٹھ جاتے۔ سرسید نے شبلی کی یہ کیفیت دیکھی تو الماریوں کے سامنے کرسی رکھوا دی۔ شبلی کے مطابق، سرسید کے پاس یورپ کی مطبوعہ تاریخ و جغرافیہ کے موضوعات پر عربی کی چند ایسی کتابیں تھیں، جن کو ہندوستان کے بڑے بڑے لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔[۴] یہی وہ دَور ہے، جب شبلی نے تاریخِ اسلام لکھنے کا ارادہ کیا۔ کام کی وسعت کو دیکھتے ہوئے تاریخِ اسلام میں سے صرف بنی عباس تک محدود رہنے کا فیصلہ کیا، پھر ہر خاندان میں سے ایک ایک فرماں روا کے حالات و واقعات قلم بند کرنے کا ارادہ کیا، البتہ بعد میں اس میں بھی ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی اور شبلی نے نامورانِ اسلام پر کام شروع کر دیا، جس کے تحت المامون، الفاروق اور سیرۃ النعمان کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۸۸۷ء میں اوّل الذکر اور ۱۸۹۱ء میں آخر الذکر زیورِ طبع سے آراستہ ہو گئیں، البتہ الفاروق کو بوجوہ مؤخر کرنا پڑا۔ اسی عرصے میں فرماں روایانِ اسلام کے سلسلے میں ان کے مطالعے میں غیر مسلموں کے بعض اعتراضات آئے تو ان الزامات کے ردّ و ابطال میں الجزیہ کے نام سے ایک رسالہ تحریر کیا۔ قیامِ علی گڑھ میں شبلی نے ۱۸۹۲ء میں ممالکِ اسلامیہ کا سفر کیا، جن میں روم (استنبول، ترکی)، شام اور مصر شامل تھے۔ اس سفر کی رُوداد انھوں نے سفرنامۂ روم و مصر و شام کے نام سے تحریر کی۔ یہ سفرنامہ اپنی تخلیق، ترتیب اور نتائج کے اعتبار سے شبلی اور علی گڑھ کے نقطۂ نظر کا بہترین امتزاج ہے۔

مثنوی صبحِ امید کے بعد شبلی کی سخنوری جاری رہی اور متعدد اردو فارسی نظمیں معرضِ تحریر میں آئیں، ان میں سے ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۳ء کے دَوران میں لکھی گئی سولہ فارسی نظموں پر مشتمل شبلی کا اوّلین مجموعۂ نظم مطبع مفید عام آگرہ سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ ان نظموں کا زیادہ تر تعلق علی گڑھ، متعلقاتِ علی گڑھ اور روم و مصر و شام کے سفر سے ہے۔

علی گڑھ میں شبلی کا تیسرا اہم موضوع علمِ کلام رہا۔ ۱۸۹۲ء کے آس پاس شبلی تاریخ کے ساتھ ساتھ علمِ کلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ شبلی کے ہاں اس موضوع سے دلچسپی کا ابتدائی اظہار اُس وقت ہوتا ہے، جب وہ استنبول کے کتب خانوں سے استفادہ کر رہے تھے۔ سرسید کے نام ۸/مئی ۱۸۹۲ء کے مکتوب میں شبلی نے

استنبول میں نادر کتابوں کی موجودگی، امام غزالی کی کتب اور ان کے خطوط کی دستیابی کا ذکر کیا[۵] اور پھر ۲۵رمئی ۱۸۹۲ء اور ۱۵ر جون ۱۸۹۲ء کے خطوں میں معتزلہ سے متعلق کتب کی عدم دستیابی کی بابت بتایا۔[۶] یہ باتیں سرسید کے بعض استفسارات کے جواب میں لکھی گئی ہوں یا خود اپنی دلچسپی سے، لیکن یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ شبلی کو اس موضوع سے کہیں نہ کہیں مناسبت ضرور تھی۔ ۱۸۹۳ء میں سرسید نے انھیں الغزالی لکھنے کی فرمائش کی تھی،[۷] لیکن غالباً سرسید کے خیالات سے فکری اختلاف کے خدشے کے پیشِ نظر انھوں نے اس جانب کوئی توجہ نہ دی۔ جیسے ہی شبلی علی گڑھ سے رخصت ہوئے، اس موضوع پر کام شروع کر دیا، البتہ اس کی تکمیل ۱۹۰۲ء میں حیدرآباد جا کر ہوئی۔ الغزالی اپنے نام سے بظاہر ایک سوانح عمری محسوس ہوتی ہے، لیکن حقیقتاً یہ علمِ کلام کے سلسلے کی ابتدائی کڑی ہے۔ شبلی نے اس کے دیباچے میں علمِ کلام کو مسلمانوں کی خاص ایجاد اور مہتم بالشان علم قرار دیا اور مطلع کیا کہ وہ علمِ کلام کی مبسوط تاریخ لکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے خیال میں، انھوں نے امام غزالی کے حالات اور کارناموں کو قلم بند کرنا شروع کیا تو وہ اس قدر طویل ہو گیا کہ علیحدہ کتابی شکل میں شائع ہوا۔[۸] اس کے بعد شبلی نے علم الکلام (۱۹۰۲ء) اور الکلام (۱۹۰۴ء) تصنیف کیں۔ علمِ کلام پر تصانیف کے اس سلسلے میں موجودہ ترتیب سے متعلق انھوں نے لکھا ہے:

> مَیں علما وغیرہ کو جس سطح پر لانا چاہتا ہوں، اس کے لیے زینے درکار ہیں۔ الغزالی پہلا زینہ ہے، دوسرا زینہ علمِ کلام، پھر اصلی سطح، یعنی علمِ کلام جدید، جو زیرِ تصنیف ہے۔ غزالی میں اگر کھل کھیلتا تو علما برسوں، بلکہ قرنوں کے لیے ہاتھ سے نکل جاتے اور مجھ کو ان سے کٹ کر الگ ہو جانا منظور نہیں۔[۹]

یہ تصانیف بظاہر حیدرآباد میں اپنے قیام کے عرصے میں پایہ تکمیل کو پہنچیں، لیکن ان کا فکری رشتہ علی گڑھ سے ہے اور بالخصوص الغزالی کی فرمائش تو سرسید کر چکے تھے، لیکن اُس وقت شبلی نے اس پر الفاروق کو ترجیح دی۔

اس نقطۂ نظر سے شاید انکار نہ کیا جا سکے کہ قیامِ علی گڑھ میں شبلی ماضی، حال اور مستقبل میں جیتے رہے۔ ابتدائی برسوں میں وہ علی گڑھ کی آزادہ روی کے ساتھ ساتھ اعظم گڑھ کے مدرسوں کی فضا میں سانس لیتے ہیں، جس کی شہادت سیرۃ النعمان کی تالیف ہے؛ جب کہ دوسری جانب اُن کی نظر علی گڑھ سے بعض

فکری اختلافات کے باعث مستقبل کے امکانات پر بھی رہی۔ سرسید دعا کیا کرتے تھے کہ مولوی شبلی الفاروق نہ لکھیں، بلکہ اصرار کرتے تھے کہ اپنا سفرنامہ ختم کرنے کے بعد الغزالی لکھ دیں[۱۰] مگر اپریل ۱۸۹۴ء میں کانپور میں ندوۃ العلما کا قیام عمل میں آیا تو شبلی کو اپنی خواہشات کی تکمیل نظر آئی، چناں چہ 'انھوں نے اس صدا پر نہ صرف یہ کہ لبیک کہا، بلکہ اُس وقت سے وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا'۔[۱۱] دیکھا جاسکتا ہے کہ زندگی کے آخری برسوں تک شبلی کسی نہ کسی بہانے اس ادارے سے منسلک رہے۔ علی گڑھ کے ساتھ ساتھ ندوہ کی سرگرمیوں میں شبلی کا عمل دخل بڑھا تو خیالات میں تبدیلی رونما ہونا ناگزیر تھا۔ اب وہ منصوبے، جو محض علی گڑھ اور سرسید سے تعلق کی بِنا پر معرضِ التوا میں پڑے تھے، ان کے رو بہ عمل لانے کا وقت آ گیا، چنانچہ اگست ۱۸۹۴ء میں الفاروق لکھنے کا ارادہ کرلیا۔[۱۲] چار سال میں یہ تالیف مکمل ہوئی اور سرسید کی وفات کے بعد شائع ہوگئی۔

حیدرآباد دکن سے اپریل ۱۹۰۱ء میں ریاست کے امورِ مذہبی کے صیغہ میں مددگار معتمد کے عہدے کی پیش کش ہوئی تو شبلی نے معذرت کی، البتہ بعد میں انھیں سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت پیش کی گئی، جسے شبلی نے منظور کر لیا اور ۲۲ رمئی ۱۹۰۱ء کو اس منصب پر فائز ہو گئے۔ یہی وہ دَور ہے، جب شبلی کے تصنیفی موضوعات کا رُخ بتدریج شعر و ادب کی طرف ہو گیا۔ ایک تو نواب مرزا داغ اور امیر مینائی کی موجودگی کے باعث حیدرآباد کی پُر رونق ادبی فضا، اس پر انجمن ترقی اردو کی نظامت، یہ صورتِ حال شبلی کے ادبی ذوق کی آبیاری کے لیے نہایت مفید ثابت ہوئی۔ ۷ نومبر ۱۹۰۳ء کو مولوی محمد سمیع کے نام خط میں میر انیس کے کلام پر ایک مفصل ریویو لکھنے اور بعد میں اس کی کتابی صورت میں اشاعت کے ارادے کی اطلاع دی۔[۱۳] یہاں ان کی تالیف الکلام شائع ہوئی تو معتمد کی طرف سے دیباچے میں مطلع کیا گیا کہ 'الکلام اس سلسلۂ آصفیہ کی نویں جلد ہے، دسویں موازنۂ انیس و دبیر اور گیارھویں سوانح عمری مولانا روم'۔[۱۴]

حسبِ سابق حیدرآباد کے تمام خواب قیامِ حیدرآباد (۱۹۰۱ء-۱۹۰۵ء) میں شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے، چنانچہ اوّل تو مذکورہ ترتیب الٹ ہوگئی اور مزید یہ کہ سوانح عمری مولانا روم حیدرآباد سے رخصتی کے بعد ۱۹۰۶ء میں اور موازنہ ۱۹۰۷ء میں مکمل ہوکر زیورِ طبع سے آراستہ ہوئیں۔

حیدرآباد کے زمانۂ قیام نے شبلی کی تنقیدی صلاحیتوں کو بہت جلا بخشی، چناں چہ سوانح عمری مولانا روم اور موازنہ کے ساتھ ساتھ فارسی شاعری اور اس کی تاریخ پر بھی اُن کی نظر رہی۔ فارسی شاعری

کی تاریخ کی طرف شبلی کی ابتدائی توجہ اُس وقت سے معلوم ہوتی ہے، جب انھوں نے مئی ۱۸۹۴ء میں اپنے دوست پروفیسر آرنلڈ کی اطلاع پر جرمن پروفیسر جیمس ڈارمسٹیٹر کی فرانسیسی ۸۸ صفحات پر مشتمل ایک مختصر کتاب منگوائی۔ (۱۵) اس کے بعد ۱۰/ جولائی ۱۸۹۹ء کو حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں اس موضوع پر لکھنے کی ترغیب دی، معاونت کا وعدہ کیا اور موادِ تحریر، عنواناتِ مضامین وغیرہ سب سامان مہیا کرنے کا یقین دِلایا۔ (۱۶) چوں کہ اُن دِنوں شبلی کے پاس فارسی کا ایک بھی دیوان موجود نہ تھا، چنانچہ ۲۶/ جولائی ۱۸۹۹ء کے خط میں مطلع کیا کہ انھیں [شبلی کو] صرف عالمِ خیال سے کام لینا پڑے گا۔ (۱۷) اسی خط میں شبلی نے شروانی کو اس منصوبے کا خاکہ بھی پیش کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت تک شبلی اپنے موضوع سے متعلق خوب غور وفکر کر چکے تھے۔ اگرچہ ۲/ مئی ۱۹۰۲ء کو مہدی افادی کو آگاہ کیا کہ فارسی شاعری کی باری دو ایک برس کے بعد آئے گی، (۱۸) لیکن عملاً اس کا آغاز حیدرآباد سے رخصتی کے بعد ۶/ مارچ ۱۹۰۶ء کو ہوا، بیچ بیچ میں موازنہ اور الندوہ سدراہ رہے، جب موازنہ سے بالکل فارغ ہو کر ہمہ تن اس کام میں مصروف ہوئے، یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۰۷ء کی چھٹی تاریخ کو دورِ اوّل کا پہلا حصہ انجام پذیر ہوا (۱۹) اور ۱۹۰۸ء میں مطبع فیضِ عام علی گڑھ سے چھپ کر شائع ہو گیا۔

۱۹۰۶ء اور اس کے بعد سیاحت اور اقامت کی غرض سے شبلی کا متعدد مرتبہ بمبئی جانا ہوا۔ ان اسفار اور وہاں کے شب و روز نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے، جن کا اظہار ان کے خطوط اور فارسی شاعری میں ہوا ہے۔ ۲/ اگست ۱۹۰۶ء کو سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں کہ یہاں کا موسم نہایت خوش گوار ہے، قدرت اور مقدورت ہوتی تو یہیں کا ہو جاتا، (۲۰) ۱۰/ اگست ۱۹۰۶ء کو مہدی افادی کو بتاتے ہیں کہ یہاں کا موسم آج کل اس قدر فرحت انگیز ہے کہ وہاں سے اندازہ بھی نہیں ہو سکتا، (۲۱) ۱۱/ ستمبر ۱۹۰۶ء کو انھیں کو مطلع کرتے ہیں کہ انیس برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں، آدمی ضبط نہیں کر سکتا، (۲۲) ۲۶/ فروری ۱۹۰۸ء کو حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو آگاہ کرتے ہیں کہ اب کے بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں، آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے (۲۳) اور ۲/ مارچ ۱۹۰۸ء کو مہدی افادی کو تحریر کرتے ہیں کہ بمبئی میں بڑی دلچسپیاں رہیں، جو موزوں ہو کر قلم سے نکلیں۔ بعض غزلیں زیادہ شوخ ہو گئیں، جو شاید ایک پنجاہ سالہ مصنف کے چہرے پر نہ کھلیں۔ (۲۴)

بمبئی کی ان صحبتوں کے اثرات اُن غزلوں میں بخوبی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں، جو ۱۹۰۸ء میں

دستۂ گُل کے نام سے قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہونے والے مجموعہ کلام میں شامل ہیں۔ شبلی کے نام اپنے خط میں حالی نے لکھا تھا کہ 'کوئی کیونکر مان سکتا ہے کہ یہ اُس شخص کا کلام ہے، جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح عمری مولانا روم جیسی مقدس کتابیں لکھی ہیں'۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ غزلیاتِ حافظ کا جو حصہ محض رندی و بیباکی کے مضامین پر مشتمل ہے، ممکن ہے کہ اس کے الفاظ میں زیادہ دل رُبائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بہت زیادہ گرم ہیں۔ (۲۵) ۱۹۰۸ء ہی میں فارسی کلام کا مجموعہ بوے گُل کے نام مطبع احمدی علی گڑھ سے شائع ہوا، لیکن اس میں جذب و کیف کی وہ کیفیت نہ تھی، جو دستۂ گُل کی انفرادیت ہے۔ مہدی افادی کے نام ۸ رمئی ۱۹۰۹ء کے خط میں شبلی نے اعتراف کیا تھا کہ واقعی دونوں کے شانِ نزول اسی قدر مختلف ہیں، جس قدر دونوں کے جوش و سرمستی میں فرق ہے۔ (۲۶)

بمبئی سے واپسی پر غالباً نومبر ۱۹۰۶ء میں شبلی نے اپنے شاگرد محمد علی جوہر کی دعوت پر بڑودہ میں قیام کیا اور بعد ازاں ان کی تحریک پر ایک سلسلۂ مضامین میں اورنگ زیب عالمگیر پر وارد الزامات کا جواب لکھنا شروع کیا۔ ان مضامین کی اشاعت دسمبر ۱۹۰۶ء سے مارچ ۱۹۰۸ء تک جاری رہی اور ۱۹۰۹ء میں انھیں اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔

ندوہ سے شبلی کا تعلق ۱۸۹۴ء کو استوار ہوا تو نشیب و فراز کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری برس تک قائم رہا۔ ندوہ سے شبلی کے تعلق کو قدیم مدرسوں اور علی گڑھ جیسے جدید تعلیمی ادارے کا ردِّعمل قرار دیا جائے تو شاید کچھ غلط نہ ہوگا۔ ایک طرف شبلی قدیم مدرسوں کی فرقہ وارانہ کتب و رسائل سے نالاں ہو چکے تھے تو دوسری جانب وہ مستشرقین کی تحقیقات سے بھی مطمئن نہ تھے۔ اگرچہ ابتدائی مذہبی تصانیف کے بعد شبلی کبھی شعر و سخن کے طرف گئے، کبھی تاریخ کے میدان میں سرگرم رہے، کبھی سوانح عمریاں لکھنے لگے اور کبھی علمِ کلام سے دلچسپی ظاہر کی؛ لیکن ان کی تصانیف کا تعلق بالعموم اسلام اور مسلمانوں سے رہا۔ مشرق و مغرب کے علم و ادب سے ان کی بے اطمینانی نے انھیں عقل و عشق کے امتزاج سے ایک نئے رنگِ تحقیق کی راہ دِکھائی۔ مذکورہ بالا تصانیف و تالیفات کے اندازِ تحریر کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تخلیق، تنقید اور تحقیق سے ہوتے ہوئے شبلی اُس مقام تک پہنچ چکے تھے، جہاں وہ جذبہ و فکر پر مشتمل کسی معیاری تحقیقی کام کا آغاز کر سکتے تھے۔ یہی وہ موقع تھا، جب وہ اپنا زندگی کا آخری معرکہ سر کرنے کو تیار ہوئے اور زندگی بھر کے مجاہدے کے ثمرات سمیٹنے

کے لیے سیرۃ النبی لکھنے کا ارادہ باندھنے لگے۔

حضور نبی کریم ﷺ سے متعلق اُن کی تصنیفی وابستگی کا آغاز ۱۸۷۶ء میں اُس وقت ہوتا ہے، جب وہ حج بیت اللہ کے لیے حجازِ مقدس پہنچتے ہیں اور روضۂ رسول کی زیارت کرتے ہیں اور یہ اشعار کہتے ہیں:

اے بہ کرم کار جہاں کرد ساز　　مر ہمہ را پیشِ تو روے نیاز
چوں بہ درت آمدہ ام با امید　　از کرمِ خویش مکن نا امید
چوں بہ درت آمدم امیدوار　　سایۂ لطفے ز سرم برمدار[۲۷]

آغازِ شباب کی ایک اَور نعت کا پہلا بند ملاحظہ کیجیے:

یا سائلی عن ذالخبر، رحمے کہ امروزم دگر　　از دیدہ شد خونِ جگر، و ز دُود آہِ بی اثر
آید جہانم در نظر از بخت خود ہم تیرہ تر　　تا کی تواں کردن بسر، آتش زدہ در جان وتن[۲۸]

علی گڑھ میں سرسید کی فرمائش پر تدریسی ضرورت کے تحت شبلی نے عربی زبان میں چوّن (۵۴) صفحات پر مشتمل ایک مختصر رسالہ تاریخ بدء الاسلام تحریر کیا، جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سیرت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۹۱ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا اور اس کی اہمیت کے پیش نظر بعد ازاں اس کا فارسی ترجمہ مولانا حمید الدین فراہی اور اردو ترجمہ محمد حمید اللہ نے کیا۔

شبلی نے حیدرآباد کے قیام میں سیرت النبیؐ پر لکھنے کا آغاز کیا اور ۲۷ رمئی ۱۹۰۳ء کو مولوی حسین عطاء اللہ حیدرآبادی کو جنابِ سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری لکھنے سے متعلق مطلع کیا۔[۲۹] سید سلیمان ندوی نے اطلاع دی ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہی، صرف [تین] ہجرت تک لکھ کر چھوڑ دیا تھا [اور یہ کہ] وہ ناتمام مسودہ دارالمصنّفین میں موجود ہے،[۳۰] گویا سیرت پر لکھنے کی ابتدا حیدرآباد میں ہوئی، لیکن وسائل کی کمی، مصادر ومنابع کے فقدان اور تحقیقی طریقِ کار سے متعلق عدم اطمینان کے باعث اس کام کو جاری نہ رکھ سکے۔

سیرت لکھنے سے متعلق شبلی کی توجہ کی ایک نشان دہی مولانا محمد علی جوہر نے سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط میں کی ہے:

> ۱۹۰۶ء میں مولانا و استاذنا شبلی مرحوم بڑودہ میری دعوت پر تشریف لائے اور میرے ہی پاس مقیم تھے۔ اُس زمانے میں مَیں نے عرض کیا تھا کہ یہ تو فرمایئے کہ سیرۃ النبی کا کیوں انتظام نہیں فرماتے۔ ہندوستان میں کون ہے، جو کفار کے پے در پے، مگر بے جا

سے بے جا حملوں کا جواب دے گا۔ نہ معلوم، اس سے قبل مولانا مرحوم کو کتنی بار اس مقدس کام کا خیال آیا ہوگا، مگر طرزِ گفتگو سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر نے اثر کیا اور آخری فیصلہ کم سے کم بڑودہ ہی میں رہ کر کیا گیا۔ (۳۱)

اس بیان کو اگر پوری حقیقت نہ بھی کہا جائے تو مبہم ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ سیرت سے متعلق باقاعدہ اعلان (۱۹۱۲ء) سے پہلے ہی شبلی اس کام کا آغاز کر چکے تھے، جیسا کہ پروفیسر عبدالقادر کے نام جون ۱۹۱۱ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

سیرتِ نبوی، جو زیرِ تصنیف ہے، مَیں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنّفین نے جو کچھ آنحضرتؐ کے متعلق لکھا ہے، اس سے پوری واقفیت حاصل کی جائے، تاکہ ان کے تائیدی بیان حسبِ موقع حجتِ اسلامی کے طور پر پیش کیے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں، نہایت زور وقوت کے ساتھ ان کی پردہ دری کی جائے۔ (۳۲)

باقاعدہ اعلان الندوہ کے شمارے جنوری ۱۹۱۲ء میں کر دیا گیا اور جون ۱۹۱۲ء میں بمبئی میں تالیف کا آغاز ہو گیا؛ گویا شبلی کی زندگی بھر کی تصنیفی و تحقیقی ریاضتوں اور کاوشوں کا ثمر سیرت النبیؐ کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیرت النبیؐ کی تالیف کے لیے شبلی نے زندگی بھر علمی، تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی سفر کیا اور بالآخر سیرت کی منزل حاصل کر لی۔

مذکورہ بالا مباحث کے بعد یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ اعظم گڑھ کی فضا میں شبلی پر مسلکی رنگ غالب تھا، علی گڑھ تحریک سے منسلک ہوئے تو ان کی نظم ونثر کا رُخ قومی معاملات کی طرف مڑ گیا اور تاریخ و علمِ کلام سے متعلق تصانیف منظرِ عام پر آئیں، ندوہ سے وابستگی نے انھیں قدیم وجدید تعلیم سے ایک قدم آگے بڑھا دیا، حیدرآباد کی علمی و ادبی ماحول میں رہ کر وہ اردو فارسی شعر و ادب کی تنقید پر وہ کچھ لکھ گئے کہ آج شبلی کی ادبی حیات کی ایک بڑی وجہ یہی تصانیف قرار دی جا سکتی ہیں، جب کہ بمبئی کے شب و روز نے ان کی شاعری کو ایک نئی جہت اور جوش و ولولہ عطا کیا۔ یہ ساری گفتگو بیکار تھی کہ اگر ان تمام سرگرمیوں کے نتیجے میں ان کی مؤلفہ سیرت منصۂ شہود پر نہ آتی۔ اگرچہ اس تالیف کا کسی ادارے، کسی علاقے، کسی دَور سے تعلق قرار نہیں دیا جا سکتا، لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی دَور میں مدارس میں زیرِ تعلیم رہنے، علی گڑھ میں سرسید کے بعض مغرب زدہ افکار سے اختلاف کرنے اور ندوۃ العلما میں شامل ہونے کی وجہ سے ان کا ذہنی ارتقا

انھیں اس مقام پر لے آیا تھا، جہاں اگر وہ سیرت نگاری کی طرف توجہ نہ دیتے تو زندگی بھر کی ریاضت رائیگاں جاتی:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی　　مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃِ پیغمبرِ خاتم　　خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا(۳۳)

حواشی

۱۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۱۰
۲۔ شبلی نعمانی، سفرنامۂ روم و مصر و شام، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء)، ص ۳۳
۳۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۱۳۴
۴۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۱۶ء)، ص ۶۰
۵۔ شبلی نعمانی، مکتوباتِ شبلی مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، (اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۳
۶۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، محولۂ بالا، ص ۱۳، ۱۴، ۱۵
۷۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۲۹۵
۸۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، آثارِ شبلی، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۵۲
۹۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، ۱۵۰
۱۰۔ سرسید احمد خاں، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۰/ مارچ ۱۸۹۳ء
۱۱۔ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۲۴۳
۱۲۔ شبلی نعمانی، الفاروق، (کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۹
۱۳۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۱۹۱۶ء)، ص ۱۱۲
۱۴۔ بحوالہ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، محولۂ بالا، ص ۳۰۵
۱۵۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، ج اوّل، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۴
۱۶۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، محولۂ بالا، ص ۱۲۳
۱۷۔ ایضاً، ص ۱۲۵
۱۸۔ ایضاً، ص ۲۳۰
۱۹۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، ج اوّل، محولۂ بالا، ص ۱۵
۲۰۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج دوم، محولۂ بالا، ص ۷۲
۲۱۔ ایضاً، ص ۲۳۷
۲۲۔ ایضاً، ص ۲۳۷
۲۳۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، محولۂ بالا، ص ۱۷۹

۲۴۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج دوم، محولۂ بالا، ص ۲۴۵
۲۵۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی (مرتب)، علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، (اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۶
۲۶۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج دوم، محولۂ بالا، ص ۲۵۲
۲۷۔ شبلی نعمانی، کلیات شبلی فارسی، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۰۰
۲۸۔ ایضاً، ص ۹۶
۲۹۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی، (اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء)، ص ۳۲۶
۳۰۔ ایضاً
۳۱۔ بحوالہ سید سلیمان ندوی، حیاتِ شبلی، ص ۵۴۰
۳۲۔ شبلی نعمانی، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۱۶ء)، ص ۲۳۸-۲۳۷
۳۳۔ شبلی نعمانی، کلیاتِ شبلی اردو، (اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۱۲

مآخذ

۱۔ الاعظمی، محمد الیاس، ڈاکٹر: آثارِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۳ء
۲۔ _____، (مرتب): علامہ شبلی کے نام اہلِ علم کے خطوط، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۳ء
۳۔ شبلی نعمانی، الفاروق، کراچی: دارالاشاعت، ۱۹۹۱ء
۴۔ _____، سفرنامۂ روم و مصر و شام، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء
۵۔ _____، شعر العجم، ج اوّل، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۰ء
۶۔ _____، کلیاتِ شبلی اردو، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۷ء
۷۔ _____، کلیاتِ شبلی فارسی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۵ء
۸۔ _____، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۸۹ء
۹۔ _____، مکاتیبِ شبلی، ج اوّل، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۱۹۱۶ء
۱۰۔ _____، مکاتیبِ شبلی، ج دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین، ۱۹۱۶ء
۱۱۔ _____، مکتوباتِ شبلی مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، اعظم گڑھ: ادبی دائرہ، ۲۰۱۲ء
۱۲۔ ندوی، سیّد سلیمان، حیاتِ شبلی، اعظم گڑھ: دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۰۸ء

اخبارات و رسائل

۱۔ سرسید احمد خاں، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۱۰/ مارچ ۱۸۹۳ء